شاہ محمد جعفر پھلواروی

# ہمارے مذہبی راہنما

یہ بالکل صحیح ہے کہ قوم جیسی ہوتی ہے ویسے ہی اس کے رہبر ہوتے ہیں جیسا دودھ ویسا مکھن ۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جیسے رہبر ہوں گے ویسی ہی قوم بھی ہوگی ۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ دانت خراب ہونے سے معدہ خراب ہوتا ہے اور معدہ خراب ہو تو دانتوں میں خرابی آتی ہے ۔ بایں ہمہ اس چکر کا کہیں نہ کہیں سے آغاز ضرور ہوتا ہے ۔ ہمارا غالب رجحان یہ ہے کہ قوم اور اس کے مقتداؤں میں اوّلیت مقتداؤں کو حاصل ہوتی ہے ۔ یعنی آغازِ کار رہبروں سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اپنے طرزِ عمل سے افراد کو راستہ دکھاتے ہیں اور وہ اس پر چل پڑتے ہیں ۔ راہنما صحیح یا غلط راستہ دکھانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں ؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن ابتدائے کار انہیں سے ہوتی ہے ۔ اس لیے اچھے اور بُرے نتائج کی ذمے داری بھی افراد قوم سے زیادہ ان کے رہبروں پر ہوتی ہے ۔ راہنمائی تو کرتے ہیں مقتدا اور قوم کرتی ہے تقلید ۔ اس کے بعد کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے ۔ جس کی ذمے داری دونوں پر عائد ہوتی ہے ۔ تقلید کرنے والوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو غلط راہنمائی کو سمجھنے کے باوجود تعاون کرتے ہیں اور زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے حقیقتِ حال کو نہیں سمجھتے اور نیک نیتی سے غلط راہنمائی کا ساتھ دیئے چلے جاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کے مقلد خراب نتائج کے زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں ۔ راہنمائی کسی خاص شعبے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ہر شعبۂ حیات میں اس کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جس میں مذہبی زندگی بھی شامل ہے ۔ اور مذہبی امور میں مقتداؤں کی راہنمائی پر غور کرتے ہوئے اس کلیئے کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے ۔

حدیث نبوی میں مقتداؤں کی ذمے داری کو یوں بیان کیا گیا ہے :

کلکم راع و مسئول عن رعیتہ — تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی ۔

اور اس کے بعد ہی حضورؐ نے راعی و رعایا کی کچھ تفصیلات بھی بیان فرمائیں جو یہ ہیں :

فالامام راع و مسئول عن — لہٰذا امام راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت و باشندگان

رعیتہ، والرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والمرأۃ فی بیت زوجھا راعیۃ ومسئولۃ عن رعیتھا والخادم فی مال سیدہ راع وھو مسئول عن رعیتہ

مملکت) کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ مرد اپنے بال بچوں کا راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کی باز پرس ہوگی۔ عورت بھی اپنے شوہر کے گھر کی راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ نوکر بھی اپنے مالک کے مال کا راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کی باز پرس ہوگی۔

راوی (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے شاید یہ بھی فرمایا ہے کہ:

والرجل فی مال ابیہ راع ومسئول عن رعیتہ

آدمی اپنے باپ کے مال کا بھی راعی ہے اور اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اس کے بعد حضورؐ نے اس کلئے کو پھر زیادہ زوردار طریقے سے یوں دہرایا:

فکلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ

غرض تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی (رواہ البخاری ومسلم وابوداود والترمذی)۔

راعی کے معنی ہیں چرواہا اور رعیت کہتے ہیں چرنے والے جانور کو۔ راعی کا فرض ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو بھٹکنے نہ دے۔ دوسرے کی چراگاہ میں نہ جانے دے۔ کسی خطرے کی طرف نہ جانے دے۔ بیرونی خطروں سے محفوظ رکھے۔ اور پیٹ بھر کر چرنے دے۔ غرض پوری نگہداشت، حفاظت اور محبت کے فرائض انجام دے۔ پس جو شخص جن چیزوں کا ذمے دار ہے وہ ان کا راعی ہے اور وہ چیزیں اس کی رعیت۔ باشندگانِ مملکت کا ذمے دار امام یا امیر ہے۔ عورتوں بچوں کی ذمے داری مردوں پر ہے۔ گھر کی ذمے داری عورت کے سپرد ہے۔ اور خادم یا فرزند جس کے سپرد مال ہو) اس مال کا ذمے دار ہے۔ غرض ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ "باز پرس" کا یہ مطلب نہیں کہ صرف قیامت میں ہوگی بلکہ مسئول کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذمے دار اور جواب دہ ہے۔

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی اچھائی یا برائی کے ذمے دار وہ رہبر ہیں جو اس کے راعی و مسئول ہیں اور جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کے جواب دہ بھی وہی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رعیت اس ذمے داری سے بالکل بری ہے۔ رعیت اگر صاحب عقل ہے تو غلط اقتدا کی ذمے داری اس پر بھی عائد ہوگی۔ البتہ عقل اور نیت کے تفاوت سے ذمے داری میں بھی تفاوت ہوگا۔

قرآنی نقطۂ نگاہ اس معاملے میں یوں ہے:

وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراءنا فاضلونا السبیلا (۳۳ : ۶۷)

اہل کفر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے تو اپنے سرداروں اور بڑوں کی پیروی کی پھر انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ گمراہ طبقہ یہی عذر پیش کرے گا کہ "ہمیں گمراہ کرنے والے یہی بر خود غلط راہنما ہیں اور ہماری غلطی صرف یہ ہے کہ ان کی بات مانتے چلے گئے۔" لیکن محض اتنے سے عذر سے کوئی گمراہ نتائج بھگتنے سے بچ نہیں سکے گا۔ اگر اوپر کی درج کردہ حدیث اور اس آیت قرآنی کو ملا کر دیکھئے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راعی اور رعایا ——— دوسرے لفظوں میں مقتدا اور مقلد ——— دونوں ہی ذمے دار ہیں۔ اگر صحیح راہنمائی ہے تو دونوں ہی کو اس کا کریڈٹ ملے گا۔ اور غلط راہنمائی ہے تو نتائج بھگتنے میں دونوں شریک ہوں گے۔ راہنما اس لیے کہ انہوں نے غلط راستہ دکھایا اور قوم اس لیے کہ اس نے اس غلط راستے کو اختیار کیا۔

بایں ہمہ یہاں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدائے کار راہنماؤں کی طرف سے ہوتی ہے اور قوم تعاون کر کے اسے انجام تک پہنچاتی ہے۔ لہذا ہمارے نزدیک مقتداؤں کو ہر نوع تقدم و اولیت حاصل ہے اور ان کی ذمے داریاں مقلدوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہیں۔ مقلد خواہ ان کی بات مانے یا نہ مانے اور مان لینے کے بعد خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں یا نہ ہوں۔ بہر صورت مقتداؤں کو مقلدوں سے زیادہ خوف عواقب چاہیئے کیونکہ عوام کی اصابت و خطا مقتداؤں کی اصابت و خطا پر منحصر ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے سامنے سے ایک بدمست لڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ آپ نے آواز دی کہ: "ارے او مست ذرا سنبھل کر چل ورنہ الٹ کر کہیں گر پڑے گا۔" اس نے کہا کہ: "عبدالقادر تم سنبھلے رہو۔ میرا کیا ہے؟ اگر میں الٹا تو تنہا میں الٹوں گا اور اگر تم الٹے تو سارا بغداد ہی الٹ جائے گا۔" ——— یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بات بڑے مزے کی ہے۔ عام افراد کی غلطی محدود ہوتی ہے۔ مگر خواص کی غلطی محیط اثر رکھتی ہے۔ عوام میں اگر خطا و صواب کا شعور ہو تو وہ عوام ہی کیوں رہیں اور غلطی ہی کیوں کریں؟ ان بے چاروں میں اتنا شعور نہیں ہوتا۔ ان میں شعور پیدا کرنا مقتداؤں کا کام ہے۔ وہی راستہ سجھاتے ہیں اور مقلد اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

اس وقت ہماری قوم کے مذہبی مقتدا مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کمزوری تو یہ ہے کہ باہم تعاون و اعتماد نہیں۔ اتفاق و اتحاد نہیں۔ اس عدم تعاون اور باہمی بے اعتمادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وحدتِ فکر مفقود ہے۔ وحدتِ فکر ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نصب العین

(مقصدِ حیات) میں وحدت ہو۔ نصب العین اس واحد مقصدِ زندگی کو کہتے ہیں جس سے آگے اور جس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ ہو سکے۔

فرض کیجئے ایک گھر کے افراد یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم بہر صورت اس گھر کے اندر خوشگوار فضا کو قائم رکھیں گے اور اسے خوش اسلوبی سے چلائیں گے تو جب وہ افراد خانہ سچے دل سے اسے مقصد بنالیں گے تو ہر اس فرعی اختلاف کو جو اس مقصد سے ٹکرائے دبا دیں گے۔ یا قربان کر دیں گے۔ پسند و ناپسند کا اختلاف تو بہر صورت رہے گا کیونکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ ترک و اختیار کا انفرادی فرق مٹایا نہیں جا سکتا لیکن اس کثرت میں ایک ایسی وحدت ضرور پیدا کی جا سکتی ہے جو نہ فقط یہ کہ اس اختلاف کو دبا دے بلکہ اس اختلاف کو مقصد کی تکمیل میں معاون بنا دے۔ اور جس طرح گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن" اسی طرح افراد کے مختلف اذواق کو زینتِ مقصد کا ذریعہ بنا دے۔ یہ ایک چابک دست باغبان کا کام ہے کہ مختلف رنگ و شکل کے پھولوں کو یک جا کر کے ایک حسین گلدستہ بنا دے۔ ایسا گلدستہ جس کا ہر پھول اس گلدستے کی زینت قائم کرنے میں یکساں شریک ہو۔ جو مقتدا و عوام کی تمام صلاحیتوں کو اختلافِ مذاق کے باوجود ایک نصب العین کے پیچھے لگا دے وہی اس باغ کا مالی و والی ہے۔

ہماری قوم میں دینی رہنما تو بہت ہیں لیکن کسی ایک سلسلے میں منسلک نہیں۔ ان میں وحدتِ نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم آہنگی بھی نہیں۔ یہ مذہبی راہنما مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہم ان کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے ہمارا وہ مذہبی طبقہ آتا ہے جن کو ہم حضرات "علماء" کہتے ہیں۔ ان میں کچھ مدرسین ہیں کچھ مفتین۔ کچھ واعظین و مبلغین ہیں اور کچھ ائمہ مساجد۔ پھر ان میں سے ہر ایک مسلمانوں کے کسی نہ کسی مدرسۂ فکر سے وابستہ ہے۔ جو جس مکتبِ فکر سے وابستہ ہے اس سے ایسی عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے فرقے کے سوا کسی اور کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا اور بعض مواقع پر اپنے ہم خیالوں کے سوا کسی دوسرے کو مسلمان بھی نہیں تصور کرتا۔ ظاہر ہے کہ جب عصبیت اس حد تک شدت اختیار کر لے تو اتنی فراخ دلی کہاں سے آ سکتی ہے کہ دوسرے سے ہم آہنگی پیدا ہو؟ بہ ظاہر سب کا نصب العین ایک ہے۔ زبان سے سب لا الٰہ الا اللہ کہہ کر وحدتِ نصب العین کا اقرار کرتے ہیں لیکن کسی غیر نصب العینی اختلاف کو اصل نصب العین پر قربان کرنے یا اصل کی خاطر فرع کو دبا دینے کا جذبہ نہیں رکھتے۔

اس پورے مذہبی طبقے میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ یہ صرف چند فقہی مسائل ہی کو علم سمجھتے ہیں

اور جو کچھ سوچتے ہیں دنیا کے تقاضوں سے۔ بلکہ تمام دوسرے علوم سے الگ ہو کر سوچتے ہیں۔ ان کا جمود کسی مسئلہ زندگی پر آزادانہ غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا۔ یوں تو ہمیشہ دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ دین ساری زندگی کے مسائل پر حاوی ہے لیکن زندگی سے تعلق رکھنے والے سارے علوم سے ناواقف ہونے کے باوجود کہے جاتے ہیں "عالم دین"۔ حیاتیات، عمرانیات، سیاسیات، طبیات، طبقات الارض، نباتیات، فضائیات، طبیعیات اور بے شمار سائنسی علوم و فنون کی ابجد سے بھی یہ واقف نہیں ہوتے حالانکہ زندگی سے ان تمام علوم کا گہرا تعلق ہے۔ یہ حضرات زیادہ سے زیادہ حنفی یا غیر حنفی فقہ کے عالم ہوتے ہیں۔ یا حدیث کے یا تفسیر کے یا لغت وغیرہ کے۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی طبیعیات کا عالم ہو یا فضائیات کا یا کسی اور علم کا۔ عالم دین بہر حال کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بس یہ کسی دینی جز کے عالم ہو سکتے ہیں۔ جس طرح طب کے ماہر کو طبیب اور سائنس کے عالم کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح ان حضرات کو لغوی، محدث، مفسر، فقیہہ، منطقی، فلسفی، متکلم، صرفی، نحوی وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن عالم دین یہ بہر حال نہیں ہو سکتے۔ دین میں صرف طہارت اور روزے نماز کے مسائل ہی نہیں آتے۔ سیاسیات، عمرانیات، تجاریات، عسکریات وغیرہ وغیرہ سارے کے سارے مسائل دین ہی کے اجزا ہیں اور اسی طرح اجزا ہیں جس طرح روزہ، نماز اور طہارت۔

اس لیے جو شخص جس فن کا ماہر اور جس ہنر کا عالم ہے اسی فن کے دائرے میں اس کی قیادت بھی ہونی چاہیئے۔ دوسرے فنون میں ——— بشرطیکہ ذوق سلیم بھی رکھتا ہو ——— رائے تو دے سکتا ہے اور اس کی رائے اگر وزنی ہو تو مانی بھی جا سکتی ہے لیکن بہر حال وہ دوسرے دائرے میں ذمے دار سند نہیں ہو سکتا۔ ہر فن کا ماہر ایک الگ خوشنما پھول ہے اور سارے پھولوں کو مل کر اخلاص کے ساتھ زینت چمن کے مقصد میں تعاون کرنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیئے کہ جس طرح صحت بدنی کے معاملے میں ایک معالج یا طبیب کا فتویٰ قبول کرنا اولیٰ ہے اسی طرح رویت ہلال کے بارے میں ایک ماہر فلکیات کا فتویٰ زیادہ صحیح ہے۔

جہاں تک مدرسین کا تعلق ہے ہم ثقافت کے کسی گذشتہ شمارے میں اپنی رائے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم بنیادی طور پر درست نہیں۔ کیونکہ اسلام میں دین اور دنیا کی ثنویت موجود نہیں لہذا دینی مدرسوں اور دنیوی کالجوں کے الگ الگ وجود کے کوئی معنی نہیں۔ ان دونوں کو بالکل ایک ہونا چاہیئے۔

مفتیوں کے متعلق ہماری یہ رائے ہے کہ ہر "فارغ التحصیل" کو مفتی ہونے کا حق نہیں۔ اس کے لیے

خاص شرائط کے ساتھ حکومت کی سند ہونی چاہیئے اور ان کا دائرۂ کار بھی محدود ہونا چاہیئے۔

مبلغین اور واعظین کو بھی سختی کے ساتھ اپنی حدود کا پابند کر دینا چاہیئے۔ جن باتوں سے فرقے بندی یا پارٹی بازی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو ان کی قطعی ممانعت ہو جانی چاہیئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ سیاسی پارٹیوں کی طرح ان مذہبی پارٹیوں کو بھی ختم نہ کر دیا جائے۔

ائمہ اور خطبا پر بھی اسی قسم کی پابندی ہونی چاہیئے کہ وہ کوئی تفریقِ امت پیدا کرنے والی بات نہ بیان کیا کریں۔ اپنے مسلک کی پابندی اور دوسروں سے رواداری ہو۔

اس کے بعد مذہبی راہنماؤں کا دوسرا طبقہ سامنے آتا ہے اور یہ ہیں صوفیا۔ ان کا اثر و اقتدار مذکورہ طبقۂ راہنما سے ہمیشہ زیادہ رہا ہے اور آج بھی زیادہ ہے۔ لیکن اسی قدر ان کی حالت قابلِ رحم بھی ہے۔ ان میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو کسی خانقاہ، تکیئے، گدی یا آستانے پر براجمان ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اس کے بغیر ہی راہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ دونوں طرح کے لوگوں کے متعلق آئے دن اخباروں میں صحیح اطلاعات آتی رہتی ہیں وہ بڑی افسوسناک ہیں۔ اعلیٰ روحانی اقدار کے یہ مراکز اب اسمگلنگ، اغوا، بھنگ، چرس اور نشوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ یہاں کے اوقاف اور نذرانے عیش و طرب، طوائفوں، کتوں اور بٹیروں کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ یا تندرست مفت خوروں کے لیے۔ یہاں اصلاح یا تعلیم کے کام نہیں ہوتے یا اگر ہوتے ہیں تو بالکل برائے نام محض نمائشی۔ ان کی طرف بہت جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان متبرک آستانوں کے پُر عقیدت مراسم نے عوام کے ذہنوں میں "حاجت روائی" کا ایسا عجیب تصور پیدا کر دیا ہے جو اسلامی تعلیمات سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے۔ اور اس کی اصلاح کے لیے موثر تدبیریں اختیار کرنا ضروری ہے۔ سادہ لوحوں کی یہی عقیدت مندیاں انہیں خود غرض اہلِ فریب کے جال میں پھنسا دیتی ہیں اور ان کی جان، مال اور آبرو بے تکلف ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ سیاسی فریب کاریاں دیر پا نہیں ہوتیں۔ ہماری مملکتِ پاکستان میں بھی سیاسی عیاریاں دس گیارہ سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکیں لیکن علمی یا روحانی عقیدت کی جڑیں اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ لوگ دھوکے پر دھوکا کھائے چلے جاتے ہیں مگر عقیدت میں تزلزل نہیں آتا۔ اپنی آنکھوں سے بعض بدعنوانیاں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہماری آنکھوں کی غلطی ہے۔ لٹتے اور برباد ہوتے جاتے ہیں مگر دماغ اتنا ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس بربادی ہی کو وہ اپنی روحانی ترقی سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے عوام میں صحیح اسلامی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنی عقل و فہم کو ان پیشواؤں کے حوالے نہ کریں۔

---